

انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام

(عبد الحمید)

(۳)

مغرب میں جمہوریت کے ساتھ جو نظام معیشت پروان چڑھا اسے ہم سرمایہ دارانہ نظام کے نام سے
مخبر کرتے ہیں معاشیات کے بہت سے اساتذہ نے اپنے قیمتی لمحات اور صلاحیتوں کو صرف اس کی تاریخ
ولادت معلوم کرنے میں صرف کیا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ کا خیال ہے کہ چونکہ یہ صنعتی انقلاب
(Industrial Revolution) کی پیداوار ہے اس لیے اس کی پیدائش اٹھارویں صدی
کے آخر میں ہوئی۔ اس کے برعکس دوسرے گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ اگرچہ اس طفلِ شریر کے بالغ ہونے
کا زمانہ انیسویں صدی ہے مگر اس کی پیدائش قرونِ وسطیٰ کے جاگیردارانہ نظام میں ہو چکی تھی۔

جب ہم اس ساری بحث کا منظرِ غائر مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ سب کچھ عبث اور بیکار نظر آتا
ہے۔ نظامِ ہائے حیات افراد کی طرح دنیا میں جنم نہیں لیتے بلکہ اُن کا بروز و ارتقاء درخت کی طرح
ہوتا ہے۔ اس لیے ان کی فنا اور بقا کے قوانین بھی مختلف ہیں۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ نظام کے متعلق
بھی یقین کے ساتھ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ فلاں سن میں پیدا ہوا۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ ”مادیت پرستی“
کا یہ ”طفلِ شریر“ انیسویں صدی میں اپنے شباب کو پہنچا۔ ایک المافوی عالم فرڈنر سٹرن برگ
(Fritz Sternberg) اسی خیال کی تائید کرتے ہوئے کہتا ہے :-

”سرمایہ دارانہ نظام کو موجودہ حالت پر پہنچنے کے لیے سالہا سال لگے۔ اس کے ارتقاء کی رفتار پہلے
بہت مست تھی مگر انیسویں صدی کے آخر سے لے کر پہلی جنگِ عظیم تک اس نظام نے اتنی حیرت انگیز
ترقی کی کہ اس کا تسلط ساری دنیا پر قائم ہو گیا۔“

اس وقت ہمارے پیش نظر اس نظام کی ارتقائی منازل کی نشان دہی نہیں بلکہ ہمارا مقصد صرف اس کی موجودہ حالت کا جائزہ لینا ہے۔ آج کل سرمایہ داری کی اصطلاح کسی ایسے نظام کے لیے استعمال کی جاتی ہے جس میں پیدائش دولت کے آلات و وسائل افراد کی ذاتی ملکیت ہوں اور جو اشیاء پیدا کی جائیں ان کی تقسیم کا کام بھی انہی کے ہاتھوں انجام پائے۔ اس کے علاوہ لوگوں کی معاشی جدوجہد ہر قسم کی اخلاقی قیود سے آزاد ہو۔

آگے بڑھنے سے پیشتر ہم یہاں ایک بات کی وضاحت کر دینا نہایت ہی ضروری سمجھتے ہیں۔ بعض لوگ اس نظام کو صرف ایک خاص قسم کی معاشی سہیت خیال کرتے ہیں مگر یہ ایک شدید غلط فہمی ہے جس کا شکار بعض بڑے بڑے تعلیم یافتہ آدمی بھی ہیں۔ سرمایہ داری ایک فلسفہ زندگی اور مکمل نظام حیات ہے۔ یہ ایک دین ہے جس نے اپنے مخصوص مزاج کے مطابق پچھلے سو سال میں نہ صرف یورپی زندگی کو بلکہ پوری دنیا کو متاثر کیا۔

سب سے پہلے ہم اس نظام کی بنیادوں کا ایک سرسری سا جائزہ دیتے ہیں :
 (۱) اس نظام کی خشتِ اول یہ ہے کہ افراد کو شخصی ملکیت کا غیر محدود حق حاصل ہے۔ اس میں لوگوں کو نہ صرف روزمرہ کے استعمال کی اشیاء رکھنے کی آزادی ہے بلکہ وہ اس امر میں بھی آزاد ہیں کہ آلات و وسائل کی پیدائش سے جس طرح چاہیں فائدہ اٹھائیں۔ وہ جو کام چاہیں کریں۔ جہاں ان کا جی چاہے کارخانے لگائیں، جس چیز سے انہیں نفع کی توقع ہو پیدا کریں، اور جس قیمت پر اور جن طریقوں سے اپنا مال بیچنا چاہیں۔ ان سارے معاملات میں ان پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے۔ نفع کی صورت میں انہیں جو کچھ حاصل ہو وہ اُسے بلا شرکتِ غیر اپنے مصرف میں لے آئیں۔ اسی طرح نقصان کا بوجھ بھی وہ تنہا برداشت کرنے پر آمادہ ہوں۔ سماج کو اس بات کا کوئی حق نہیں کہ وہ کسی کے کام میں مداخلت کرے۔ نظام سرمایہ داری یہ حقوق لوگوں کو اس لیے دیتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ کسب و کسب دہنر کے ملکات اپنی انتہائی وسعتوں کے ساتھ صرف اسی صورت میں رونما ہوتے ہیں جب ان کے لیے کوئی جذبہ یا کشش موجود ہو۔ یہ چیز انسان کی سرشت میں داخل ہے کہ وہ اپنی

صنعت کے حاصل کا خود مالک اور مختار ہونا چاہتا ہے۔ وہ اپنی مساعی کی پیداوار کو "میری" کہنا چاہتا ہے۔ دراصل ملکیت کی خواہش ہی ایک ایسی آرزو ہے جس کو پورا کرنے کے لیے جدوجہد کی جاتی ہے۔ (۱۲) انسان کی اس خواہش کی تکمیل اسی صورت میں ممکن ہے جب وہ اپنی ذات کے لیے کوشش کرے۔ اور اس سعی کے نتیجہ میں جو کچھ حاصل ہو وہ اس کا مالک بنے۔ یہی ایک جذبہ انسانی کوششوں کا اصلی محرک ہے۔ اس کا رگہ حیات میں جتنی رونق ہے وہ اسی کے دم قدم سے ہے۔ یہ جس قدر تگ و دو ہے سب ذاتی نفع کے حصول کے لیے ہے۔ فیض حیات میں تہرج ہے تو اسی کی وجہ سے اور نظام عالم کے عروقِ مردہ میں خونِ زندگی دودھ رہا ہے تو اسی کی حرارت سے۔ ذہن انسانی سے اگر یہ جذبہ نکل جائے تو منہنگاموں اور شورشوں کی پرشکوہ دنیا راہبوں کی جھوٹری اور سنیا سیوں کی گلیاں بن جائے۔ لہذا انسانی ترقی کا اصل معیار یہ ہے کہ وہ مادی نفع حاصل کرنے کے لیے امکانی حد تک جدوجہد کرے۔ اُس کی کوششوں کا اصل مقصد یہ ہونا چاہیے کہ وہ چھین چھپٹ کے لیے بھرپور ہاتھ مارے اور اپنی حاصل کی ہوئی دولت میں کم سے کم لوگوں کو شریک ہونے کا موقع دے۔ جب وہ آجر ہو تو اس کی نگاہیں کثیر تنخواہ پر مرکوز ہوں اور مستاجر ہونے کی شکل میں اُس کا گوہر مراد زیادہ سے زیادہ نفع کا حصول ہو۔

(۱۳)۔ اس نظام کا تیسرا اصول مسابقت ہے۔ یہ مسابقت نہ صرف مختلف طبقوں اور گروہوں کے درمیان پائی جاتی ہے بلکہ ایک ہی طبقہ اور ایک ہی گروہ کے مختلف افراد میں بھی دکھائی دیتی ہے۔ جہد للبقا (Struggle for Existance) کی کوکھ سے نکلی ہوئی اس ڈائن نے ایک ملک کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کو تاخت و تاراج کیا ہے۔ مگر اس کے سحر کا کمال یہ ہے کہ لوگ تباہی کے عمیق غاروں کی طرف لڑھکتے ہوئے بھی یہی محسوس کر رہے ہیں کہ وہ ترقی کے بامِ بلند پر جا رہے ہیں۔ نظامِ سرمایہ داری کے حامیوں کا یہ دعویٰ ہے کہ مسابقت نہ صرف بے قید معیشت میں اعتدال پیدا کرتی ہے بلکہ یہ کثیر پیداواری اور مزدور پیداواری کا سب سے بڑا محرک بھی ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو لوگوں کو ایجاد و اختراع پر ابھارتا ہے۔ پروفیسر سلگ بین (Solomon) مسابقت کا ذکر

کرتے ہوئے کہتا ہے :-

”جس طرح حیاتیات میں مسابقت ترقی کی ضامن ہے، اسی طرح معاشی رقابت سے ہی سماج کی فلاح وابستہ ہے۔ اسی سے سرمایہ میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور جب یہ جذبہ ذاتی ملکیت کی رہنمائی میں اپنا عمل شروع کرتا ہے تو یہ ترقی کے لیے سب سے بڑا محرک ثابت ہوتا ہے۔ اسی کے ذریعہ ہم اشیاء سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے ہیں۔ یہ جذبہ سماج کا سب سے بڑا پاسبان اور محافظ ہے۔ یہ صارفین (Consumers) کو نفع اندوزوں کی دست برد سے بچاتا ہے۔ افراد کے اندر استعداد پیدا کرتا ہے۔ اور سماج اور فرد کے مفاہات کو ہم رنگ اور ہم آہنگ بناتا ہے۔“

۴، اس نظام کا چوتھا اصول یہ ہے کہ اجیر اور مستاجر کے حقوق میں بنیادی فرق ہے اور اسے رکھ کر ہی ان کے باہمی مسائل کو طے کیا جاسکتا ہے۔ اس سے پورا سماج دو ایسے طبقوں میں تقسیم ہو گیا ہے جن کی باہمی کشمکش سے ہی انسانیت ترقی کرتی ہے۔ ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جو ذرائع پیداوار کا مالک ہے اور دوسرا گروہ محنت کو فروخت کرنے والوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ پہلا طبقہ اپنی ذمہ داری پر اول سے آخر تک اشیاء کی پیدائش کرتا ہے اور نفع کی صورت میں پوری دولت خود سمیٹتا ہے۔ اس کے برعکس جب نقصان ہو تو اس کا بوجھ بھی اُسے اکیلے ہی برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں مزدور پر کسی قسم کی آنچ نہیں آتی۔ یہی وہ اصل بنیاد ہے جس پر سرمایہ دار نہایت سنگدلانہ سے سنگدلانہ کارروائیوں کو مبنی برانصاف سمجھتا ہے۔ اس بے انصافی کو جائز ثابت کرنے کے لیے دلیل یہ دی جاتی ہے کہ اگر کسی آفت کے وقت سرمایہ دار پر نقصان خود برداشت کرتا ہے اور اس میں وہ کسی دوسرے کو شریک نہیں کرتا تو اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ اس سے بچنے کے لیے یا اس کو پورا کرنے کے لیے مزدوروں کا جس قدر خون چاہے نچوڑے۔ اس طرز فکر نے سماج کے دن دو طبقوں کے درمیان اختلاف کی ایک نہایت ہی گہری

خلیج حائل کر دی ہے اور یہ خلیج دن بدن وسیع ہوتی چلی جا رہی ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت اور مودت کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ سرمایہ دار ہر وقت اس ٹوہ میں رہتا ہے کہ وہ مزدور سے جتنا زیادہ سے زیادہ کام لے وہی اس کے حق میں فائدہ مند ہے۔ اسی طرح مزدور کو بھی یہ فکر ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے کہ وہ پیدائش میں زیادہ سے زیادہ حصہ حاصل کرے۔ اس رقابت نے دشمنی کی شکل اختیار کر لی ہے۔ دونوں گروہوں کے پسینے نفرت کی مشتعل آگ سے پُرمیں، جن سے سوئے خوفناک آوازوں اور جاں سوز انگاروں سے کچھ نہیں نکلتا۔ دشمنی کے اس آتش گیر مائے نے متعدد ملکوں کو تباہ و برباد کر دیا ہے اور اب بھی دل گیتی کی دھڑکنیں مزید بربادی کی دہائی دے رہی ہیں۔ مگر سرمایہ دارانہ نظام کے علمبردار اس تباہی کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کشمکش کو بالکل فطری سمجھتے ہیں اور اُن کا یقین ہے کہ یہ فطری کشمکش فطری قوانین کے تحت خود بخود کسروائے کسار سے گزر کر اجیر و مستاجر کے درمیان حقوق کا توازن قائم رکھے گی۔

(۵) اس نظام کا ایک اور اصول یہ ہے کہ معیشت کی فلاح و ترقی اور اس کے فطری نتائج کے ظہور کا دار و مدار ریاست کی عدم مداخلت پر ہے۔ ریاست کا کام صرف یہی ہے کہ وہ ایسے حالات پیدا کرے کہ انفرادی آزادی عمل زیادہ سے زیادہ محفوظ ہو سکے۔ لوگ نہایت ہی امن و امان سے معاشی تگ و دو میں مصروف رہ سکیں اور ریاست اُن کے حقوق ملکیت اور معاہدات (Contracts) کی پوری طرح نگہداشت کرے۔

(۶) اس عہد کے نظام سرمایہ داری کی گاڑی جن پہیوں پر چل رہی ہے وہ سود اور سٹہ (Speculation) ہیں۔ آج سے ایک صدی پیشتر سرمایہ لگانے والے اور صنعتی کاروبار انجام دینے والے انفرادی الگ الگ نہیں ہوتے تھے۔ اُس زمانہ میں سرمایہ دار اپنا کاروبار خود چلاتا۔ اُس کا پورا انتظام و انصرام اسی کے ہاتھ میں ہوتا۔ جب کبھی پیداوار میں کمی پیشی کرنا مقصود ہوتی تو اس کا فیصلہ بھی وہ خود ہی کرتا۔ مگر قویہ جدید میں پیش قیمت مشینوں کے استعمال نے ایک فرد کے لیے کسی کاروبار کا تنہا چلانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بنا دیا ہے۔ لہذا جو لوگ

کاروبار کا تجربہ رکھتے ہیں اُن کے لیے مزدوری ہے کہ سرمایہ کے لیے دوسروں کے سامنے دست سوال دراز کریں۔ ان حالات میں جبکہ دولت کا حاصل کرنا انسانی حیات کا اصل مقصد قرار پایا ہے کون بیوقوف ایسا ہوگا جو لوگوں کو دولت صرف اس لیے دے دے کہ وہ جا کر اس کو اپنے کاروبار میں لگائیں اُس سے خرید و دولت حاصل کریں اور بعد میں اصل رقم اپنے اس ”محسن“ کو واپس لے دیں۔ آج کے سرمایہ دار کا مطالبہ یہ ہے کہ اُسے اُس کے سرمایہ کے استحصال کا ایک معقول ”معاوضہ“ ملنا چاہیے۔ چنانچہ اُس کے اس مطالبہ کی صحت پر یقین کرتے ہوئے سرمایہ دار کا حصہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ کاروبار خواہ فائدہ میں جا رہا ہو یا نقصان میں سرمایہ دار کو اپنی محنت و جو اُس نے دولت کے جمع کرنے میں صرف کی ہے، اُن کی مزدوری مل جاتی ہے۔ اس کو کاروبار میں کوئی دلچسپی نہیں ہوتی اور اُسے اس بات کا علم تک نہیں ہوتا کہ اُس کا دیا ہوا پیسہ کن کاموں پر صرف ہو رہا ہے۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں وہ اصول جن پر نظام سرمایہ داری قائم ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سارے اصول غلط نہیں۔ ان میں کسی حد تک صداقت بھی ہے۔ آغاز میں جب ان کو آزمایا گیا تو نہایت ہی خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ اشیاء کی پیدائش میں محیر العقول ترقی ہوئی۔ افراد خوش حال ہوئے۔ مگر کچھ وقت گزرنے کے بعد جب لوگوں کا شمار اترا اور اس نظام کی چوٹوں نے لوگوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا تو پھر لوگوں کو اس کی تلخیوں کا احساس ہوا۔ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دولت میں اضافہ ہوتے دیکھا مگر ساتھ ہی اُن کے سامنے یہ حقیقت بھی آئی کہ یہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ رہی ہے۔ اگر انہوں نے ایک طرف عیش و آرام کی زندگی کے مختلف مناظر دیکھے تو دوسری طرف اُن کے سامنے خستہ حالی، غلامی اور غربت کے بھی نہایت ہی گھٹاؤنے واقعات آئے۔ اس تفاوت نے انہیں چونکا دیا اور وہ اس بات کو سمجھ گئے کہ یہ نظام سراپا خیر نہیں بلکہ اس میں شر کے بھی بے شمار پہلو ایسے ہیں جن کو کسی صورت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اب ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ اس نظام کی فکری نغرشوں کی نشان دہی کرتے ہیں :-
اس نظام کا ایک سرسری سا جائزہ لینے کے بعد یہ حقیقت خود بخود منکشف ہو جاتی ہے کہ

اس میں خرابی کی اصل خبر اس کا غلط فلسفہ زندگی ہے۔ بے جان اشیاء کی کثیر پیداواری اور زود پیداواری نے انسان سے اُس کی حقیقی قدر و قیمت چھین لی ہے۔ اب اگر اُس کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے تو اسے بھی بے جان شے سمجھ کر طلب اور رسد کے قوانین کا پابند سمجھا جاتا ہے۔ عہدِ حاضر کے معیشت دانوں نے اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے کہ انسان صرف چند دھاتوں کا مرکب ہی نہیں بلکہ وہ زندگی کے جذبات و احساسات رکھتا ہے فطرت نے اُسے ایک خاص ذوق بخش رکھا ہے۔ اس میں اخلاقی جس بھی دو بعیت کی گئی ہے۔ اس لیے اُس کی پیدائش اور اُس کے کام کو اشیاء کی پیداواری اور اُن کے استحصال پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ مگر بد قسمتی سے دورِ حاضر کے فلاسفہ نے انسان کو بھی "کارخانہ کا تیار شدہ مال" سمجھ کر یہ "فتویٰ" صادر کر دیا ہے کہ اس کی "خرید و فروخت" میں بھی قیمت ہی وہ اصل ثلث ہے جو نہایت ہی انصاف کے ساتھ ہر مستحق کو اُس کا اصل حق دلا دیتی ہے۔ یہ ہے وہ اصل خرابی جو اس نظام میں موجود ہے۔ ایک معمولی سمجھ بوجھ رکھنے والا انسان بھی اس حقیقت سے کسی قدر واقف ہے کہ کسی شے کی قیمت کا بعینِ رسد (Supply) اور طلب (Demand) کے مطابق کیا جاتا ہے۔ اگر کسی چیز کی رسد کم اور طلب زیادہ ہو تو اُس کی قیمت خود بخود بڑھ جائیگی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نفع کے روشن امکانات کے پیشِ نظر لوگ ان اشیاء کو زیادہ مقدار میں پیدا کریں گے۔ اس طرح رسد کے بڑھنے کی وجہ سے قیمتیں خود بخود اعتدال پر آجائیں گی۔ مگر اسی اصول کو جب انسانوں پر نافذ کیا جائے تو یہ انسانیت پر ایک عظیم ظلم ہوگا۔ فرض کیجیے کہ ایک پیشہ ایسا جس میں ضروریوں کی افراط ہے مگر اُن کی طلب نہیں۔ ان حالات میں کیا یہ ممکن ہے کہ ہم انسانوں کی ایک بھاری تعداد کو جلد از جلد ایسے پیشوں کی طرف منتقل کر دیں جن میں اُن کو آسانی سے کھپایا جاسکتا ہو۔ ضروریوں کی محنت کو ذخیرہ نہیں کیا جاسکتا۔ وہ بیچارے پیٹ کے بے رحم تقاضوں کے ہاتھوں اپنی محنت کو کم سے کم قیمت پر بیچنے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ فاقہ مستی ان کو خود بخود کھینچ کر سرمایہ دار کے قدموں میں لا ڈالتی ہے، سرمایہ دار اُن کی اس بے بسی اور بے کسی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اُن کو کم سے کم اجرت پیش کرتا ہے اور اُن بیچاروں کو حالات کی سنگینیں اسی پر

رضامند کر لیتی ہیں۔

جو لوگ قیمتوں کے نظام سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ تنہا ہر فریق کو اس کے جائز حقوق دلا سکتا ہے وہ اس حقیقت کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ پیدائش کرنے والے مختلف عاملین (Factors of Production) ایک جیسی طاقت نہیں رکھتے۔ ان میں بعض

زیادہ مضبوط ہیں اور بعض ان کے مقابلہ میں بے حد کمزور۔ اگر چاروں عاملین (زمین، محنت، سرمایہ اور تنظیم) ایک جیسی قوت کے مالک ہوتے تو سماج میں ہر شخص کو اپنا جائز حق مل جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ دور جدید کے معاشی نظام میں سب سے زیادہ طاقتور گروہ سرمایہ داروں اور تنظیمین کا ہے۔ اس کے بعد زمین کے مالکوں کا طبقہ ہے اور سب سے کمزور اور لاچار مزدور ہیں۔ منڈی پر جب کبھی آنت آتی ہے تو اس کی سب سے زیادہ زور محنت بیچنے والوں پر پڑتی ہے (Entrepreneurs) تنظیمین

جب یہ دیکھتے ہیں کہ قیمتیں گر رہی ہیں اور ان کے منافع کم ہو رہے ہیں تو وہ سرمایہ کاری (Investment)

میں کمی کر دیتے ہیں اس کے نتیجے میں کارخانے بند ہونا شروع ہوتے ہیں اور کاروبار ماند پڑ جاتا ہے۔ ملک کا امیر طبقہ اپنی پس انداز دولت کے ہوتے ہوئے اتنی سخت رکھتا ہے کہ نہایت ہی آرام سے مصیبت کے یہ دن گزار دے۔ اسے اشیاء سستی ملتی ہیں اس طرح وہ اپنے ایک ایک پیسے کے بدلے کئی کئی پیسوں کا فائدہ حاصل کرتا ہے۔ پھر اس کی تعداد کم ہونے کی وجہ سے وہ "اتفاق کی برکتوں سے بھرپور متنفع ہونے میں کامیاب ہوتا ہے۔ ایک گنی بندھی تجویز کے مطابق یہ لوگ نہایت ہی ہوشیاری سے اشیاء کی رسد کم کر کے منافع کو کم نہیں ہونے دیتے۔ اسی طرح سرمایہ دار بھی پیداوار میں "جزو اعظم" (Main Factor) کی حیثیت

سے داخل ہونے کی وجہ سے اپنا "سطح معاوضہ" حاصل کر لیتا ہے۔ اسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ اس کی اس پالیسی سے کتنے لوگوں پر مصیبت ٹوٹتی ہے۔ اسے بہر حال اپنا حصہ لینا ہے۔ کیونکہ یہ معاہدہ ہے امداد کی پابندی کرنا نہ صرف لوگوں کا بلکہ حکومت کا اور زمین ہے۔ زمین کے مالک بھی نسبتہ مضبوط پوزیشن سے فائدہ اٹھا کر منافع میں سے کچھ نہ کچھ

حصہ ہتھیا لیتے ہیں۔ اب میدان میں باقی ایک طبقہ ایسا رہ جاتا ہے جس کو سب سے زیادہ کمزور اور بے سہارا ہونے کی وجہ سے نہایت ہی آسانی سے مصائب کی بھٹی میں جھونک دیا جاتا ہے۔ جسم و صحت کے رشتہ کو برقرار رکھنے کے لیے اُسے روکھی سوکھی روٹی چاہیے۔ اسی طرح اپنا اور اپنے بال بچوں کا تن ڈھانکنے کے لیے اُسے کپڑے کی بھی ضرورت ہے۔ یہ دو مطالبات اتنے شدید ہیں کہ ان کو روزگار کے مہیا ہونے تک اٹھایا نہیں جاسکتا۔ اس لیے جب کام ہوتا ہے تو یہ عاتق تلاش روزگار میں صدر کی خاک چھانتا ہے اور چیخ چیخ کر کہتا ہے ”اے رزق کے مالک! تمہارا جو جی چاہے ہمیں دو۔ مگر خدا را ہمیں موت کے منہ سے بچاؤ“ سرمایہ دار اس کی مظلومیت اور بے سروسامانی کو دیکھ کر کساد بازاری کی ساری بربادیوں کو اُس کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ اُس نے اپنے ظلم و استبداد کو رعب رکھنے کے لیے حکومت سے یہ بات بحیثیت اصول کے منوالی ہے کہ وہ لوگوں کے کاروباری معاملات میں کوئی دخل نہیں دے گی۔

پھر اس نظام کو چلانے والے وہ لوگ ہیں جو بالعموم سرمایہ داروں کے طبقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ مسند اقتدار پر اتنے ہی اس لیے ہیں کہ اپنے حقوق کی ہر طرح سے حفاظت کر سکیں۔ اس لیے ان کے وجود سے ان کے اپنے گروہ کے آدمی تو عیش لوٹتے ہیں مگر دوسرے طبقے خصوصاً تہذیب فروز کی زندگی نہایت تلخ ہو جاتی ہے۔

پچھلی ایک صدی کے واقعات نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا ہے کہ بغیر کسی اخلاقی ضابطہ کی پابندی کے سوسائٹی میں انصاف اور عدل قائم نہیں رہ سکتا۔ جب لوگوں کی زندگی کا منہلے مقصد دنیوی فوائد و لذائذ سمیٹنا ہو تو پھر ان کی نظروں سے جائز و ناجائز کی تمیز بالکل اوجھل ہو جاتی ہے۔ انہیں اس بات کی کوئی فکر نہیں رہتی کہ اُن کے آمدنی کے ذرائع کن کن طریقوں سے سماج میں ظلم و ستم بے حیائی اور بد معاشی کو ترقی دے رہے ہیں۔ دولت کے بھاری کی حیثیت سے اُس کا نقطہ نظر صرف یہی ہے کہ جس طرح بھی ممکن ہو اُسے زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنی چاہیے، خواہ اُس سے اُس کی قوم اور ملت یا پوری انسانیت کو کتنا ہی نقصان پہنچے۔ اگر وہ یہ دیکھتا ہے کہ اُس کی آمدنی شرب

کی فروخت، رقص و سرود کی محفلیں سجانے اور محسوس لٹریچر کی اشاعت اور اخلاق سوز تصویریں دکھانے سے بڑھتی ہے تو فوراً اپنا روپیہ ان کاموں میں کھپا دیتا ہے اور قطعاً محسوس نہیں کرنا کہ اس کی ان حرکات سے سماج کو بحیثیت مجموعی کس قدر خسارہ برداشت کرنا پڑ رہا ہے، کتنی عسستیں لگتی ہیں، کتنی عفتیں برباد ہوتی ہیں، کتنے نو جوان آوارگی کا شکار ہوتے ہیں اور کتنے افراد مجرم بنتے ہیں یہی نہیں بلکہ سرمایہ کاری کا شیخ فحاش کی طرف موڑ دینے سے ضروریات زندگی کم یاب بلکہ نایاب ہو جاتی ہیں۔ عوام گندم کے ایک ایک دانے کے لیے ترستے ہیں، انہیں موسمی ضروریات کے لیے تو کیا اپنا منتر تک چھپانے کے لیے کپڑا نہیں ملتا۔ اُن کے پتھے دودھ کے ایک ایک قطرے کے لیے جلتے ہیں اور اُس کے برعکس دوسری طرف سرمایہ داروں کی دولت پرستی اور نفع اندوزی کے طفیل انسانوں کا ایک قلیل طبقہ رفیع الشان محلات میں رہ کر اپنا سارا وقت عیش و تنعم میں بسر کرتا ہے۔ وہ دل جو خوفِ خدا سے خالی ہوں جن کے اندر احساسِ جواب دہی ناپید ہو وہ اتنے بے حس ہوتے ہیں کہ لوگوں کے بُرے سے بُرے مصائب اُن کے اندر معمولی سے معمولی ارتعاش بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ اُن کی کیفیت یونان کے اُن فرضی خداؤں کی سی ہوتی ہے جو بلندیوں پر رہ کر صرف اپنے دھن دولت کے متعلق سوچ سکتے ہیں اور اپنے ذہن کو کبھی اس بات پر غور کرنے کے لیے تیار نہیں پاتے کہ اُن کی ذات سے انسانیت کتنے دکھوں میں مبتلا ہے۔ ایسے لوگوں کی موجودگی میں کیا یہ ممکن ہے کہ صرف قیمت کا قاضی سماج میں عدل و انصاف قائم رکھ سکے گا۔ جب لوگ اس طرز پر سوچنے کے عادی ہیں وہ جنتِ الجماع میں بستے ہیں۔

جدید سرمایہ داری کی ایک اور لعنت بے روزگاری ہے۔ انسان نے جب بھاپے فائدہ اٹھانا سیکھا تو پیداوار میں نہایت ہی سرعت کے ساتھ اضافہ ہوا۔ جو کام کئی سو انسان کئی دنوں میں کر سکتے تھے وہ اب ایک آدمی مشین کی مدد سے چند منٹوں میں کرنے لگا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ ہر ماہر ہمیشہ اس تلاش میں رہتا کہ وہ انسانوں کی تعداد گھٹا کر اُس کی بجائے مشینوں کے استعمال کو بڑھا دے۔ کیونکہ اس سے نفع میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ افراد کی جگہ مشینوں نے لینا شروع کی جب

ملک کے پوتے طول و عرض میں اسی پالیسی پر عمل ہونا شروع ہوا تو ہزاروں نہیں لاکھوں انسان بیروزگار ہو گئے۔ وہ کام حاصل کرنے کے لیے جس کارخانے کی طرف بھی رجوع کرتے کلوں کی گڑگڑاہٹ انہیں یہ بتا دیتی کہ بھاپ کے دیو کی خدمت گزاری نے اب انسانی محنت کی ضرورت باقی نہیں رہنے دی۔ لہذا اب اس آسمان کے نیچے اُن کے لیے کوئی کام نہیں، اس لیے انہیں دنیا سے جلد از جلد کوچ کرنے کی فکر کرنا چاہیے۔ ایشیائی ممالک میں اس مسئلہ نے جو صورت پیدا کر دی ہے اگر ہم اُس کو فی الحال نظر انداز بھی کر دیں تو یورپ کے صنعتی ممالک میں بے روزگاری کا جو حال ہے اس کا اندازہ مندرجہ ذیل اعداد و شمار سے لگایا جاسکتا ہے۔

ریاستہائے متحدہ امریکہ	۲۶۹۰۰۰ افراد
اطلی	۳۰۹,۰۰۰
آسٹریا	۲۲۵,۰۰۰
پولینڈ	۱۷۰,۰۰۰
برطانیہ	۱۲,۰۰,۰۰۰
جرمنی	۲۴,۰۰,۰۰۰

اس بیروزگاری نے سماج میں بے شمار کاروباری یحیدگیاں ہی پیدا نہیں کیں بلکہ اس نے اُن گنت اخلاقی اور مذہبی بیماریوں کو بھی جنم دیا ہے۔

اس عہد میں جن خوش نصیبوں کو روزگار ملتا بھی ہے وہ بھی نہ ہونے کے برابر۔ اپنی دراندگی کی وجہ سے مزدور اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنے جائز حقوق حاصل کر سکیں۔ اُن پر جس قدر کمزوری کی جاتی ہے وہ اُن کا وقت کا پیٹ بھرنے کے لیے بھی ناکافی ہوتی ہے۔ دوسری طرف سرمایہ داران اشیاء کی پیدائش میں مصروف رہتے ہیں اور پھر ان کے نکاس کی تدبیریں بھی سوچتے ہیں مگر لوگوں کی اکثریت بے روزگار یا نیم بے روزگار ہونے کی وجہ سے اپنے اندر یہ طاقت نہیں رکھتی کہ کارخانے کے تیار شدہ مال کو خریدے۔ سرمایہ دار اپنے مال کی کھپت کے لیے سب سے پہلے انہیں

بے بس عوام کی طرف دیکھتا ہے جنہیں اُس نے دھکے دے کر نہایت ہی کس مہر سی کی حالت میں اپنے کارخانے سے نکال دیا تھا۔ سرمایہ داری نظام میں یہ ایک ایسا تضاد ہے جس کو دور نہیں کیا جاسکتا۔ مزدور جب روزگار مانگتا ہے تو وہ سرمایہ دار کا دشمن ہے۔ اُسے اس مٹی کی مشین کے مقابلہ میں تو ہے کی مشین زیادہ عزیز ہے۔ مگر جب اسے اس مشین کے تیار شدہ مال کو فروخت کرنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو وہ پھر مجبوراً اپنے آپ کو اسی طبقہ کا محتاج پاتا ہے۔ مختلف جیلوں اور بہانوں سے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ لوگ کسی نہ کسی طرح اس کے مال کو خریدیں۔ سرمایہ داری نظام میں یہ ایک ایسا سقم ہے جس کو دور کرنے کے لیے انسان کو اشتراکیت اور فسطائیت ایسی خوفناک راہیں تلاش کرنا پڑیں۔ مشہور مصنف ایبرک گل (Eric Gill) اسی چیز کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :-

”ہمیں کارخانوں میں انسانوں کی ضرورت نہیں، مشینیں ان سے بہتر ہیں۔ ان کی ایجاد اور استعمال کا سب سے بڑا مقصد انسانی محنت کی بچت ہے۔ لہذا ہمیں مشین کو نہیں انسانوں کو ختم کرنا ہے بلکہ وہ انسان جسے ہم دنیا سے مٹا دیتے کے آرزو مند ہیں وہ وہ انسان ہے جو کارخانہ میں کام کرتا ہے۔ نہ کہ گلی میں بسنے والا انسان۔ محلوں میں رہنے والے انسان ہمارے ساتھی ہیں وہ ہمارے دوست ہیں۔ کیونکہ وہ ہمارا مال خریدتے ہیں۔ آج کل سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ کس طرح پیدائش میں انسانی محنت کے دخل کو ختم بھی کیا جائے اور دوسری طرف صارفین (Consumers) کی تعداد اور ان کی قوت خرید کو بھی بڑھایا جائے۔ یہی ہمارا بنیادی مسئلہ ہے، تجربہ بھی یہی ہے اور شاخ بھی یہی ہے۔“

عہدِ حاضر کی استعجالیّت (Imperialism) اسی طرز فکر کا شاخسانہ ہے جب کسی ملک کا سرمایہ دار طبقہ یہ دیکھتا ہے کہ اُس کی اپنی غلط روش اور نا عاقبت اندیشی نہ بلکہ ظالمانہ طرزِ عمل سے اُس کی اپنی قوم کے افراد اس قدر غریب اور مفلس ہو گئے ہیں کہ ان میں اس کے تیار کردہ

مال کو حاصل کرنے کی بہت نہیں رہی تو وہ پھر ملک سے باہر منڈیوں کی تلاش کرتا ہے۔ چنانچہ اس عہد کا مغربی استعمار محض ایک قسم کی منظم تجارت اور مسلسل مستقل مادی ارتفاع ہے جس کی کوئی بلند اخلاقی یا دینی غرض اور کوئی اصلاحی دہندہ بی اور شریفانہ مقصد نہیں۔ سر ولیم جانس ہاک نے جو ۱۹۲۵ء میں برطانوی وزارت کے رکن تھے۔ پارلیمنٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے اس حقیقت کا اعتراف کیا۔

”ہم نے ہندوستان اس یسوع نہیں کیا کہ ہم ہندوستانیوں کو نفع پہنچانے میں لگے۔ علم ہے کہ ہمارے مسیحی مشنری اپنے جلسوں میں کہا کرتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان اس لیے فتح کیا کہ ہندوستانیوں کے مرتبہ میں ترقی ہو یہ دعویٰ محض دھوکا ہے۔ ہم نے ہندوستان اس لیے فتح کیا ہے کہ برطانیہ کے مال و اسباب کے فروخت کے لیے ایک منڈی ہاتھ آئے۔۔۔۔۔ میں منافق نہیں جو یہ کہنے لگ جاؤں کہ ہم ہندوستانیوں کے نفع کے لیے ہندوستان پر قبضہ رکھے ہوئے ہیں۔ ہندوستان پر ہمارا قبضہ انگریزی تجارت خصوصاً ٹکاسٹار کے سوتی کپڑے کی منڈی کی حیثیت سے ہے۔“

اسی طرح سر رچرڈ کریڈک، سر مائیکل اوڈائر، لارڈ ٹرنہم، جنرل سر کلاڈ جیکب، اور مشہور مورخ سر چارلس اوہین کی ایک متحدہ تاریخ کا اقتباس حسب ذیل ہے :-

”ہندوستان ہماری مصنوعات کا دنیا میں سب سے بڑا گاہک ہے، برطانیہ جیسی کوئی تجارتی قوم ایسے گاہک کو بغیر اپنے آپ کو نقصان عظیم پہنچائے ہاتھ سے جانے نہیں دے سکتی اور یہ نقصان برداشت کرنے والے کین ہیں، ہمارے بینک، ہماری جہازی کمپنیاں، ہماری صنعتیں، ہمارے تنخواہ دار ملازمین اور ہمارے مزدوری پیشہ ملتے۔“

ان منڈیوں کی ضرورت صرف ایک قوم کو ہی نہیں بلکہ ساری مغربی اقوام کو ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہے کہ وہ اپنے لیے وسیع سے وسیع تر منڈی تلاش کرے جہاں اس کے مال کی کسپت ہو سکے۔ اس ایک ٹکسار کی تلاش میں حجب بہت سے ٹکساری نکلیں تو ان کے اندر باہمی

رقابت کا پیدا ہو جانا بالکل ایک قدرتی سی بات ہے۔ چنانچہ عہدِ حاضر کی ساری جنگیں اسی خود غرضی کا نتیجہ ہیں۔ خودِ حاضر کا ایک مبصر اسی پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

”یہ جنگ تو محض حریف جماعتوں کی ایسی کشمکش ہے جن میں سے ایک دنیا کی دولت اور آمدنی کے وسائل کے بڑے حصہ پر قابض رہنا چاہتی ہے اور دوسری اس کے حصہ کے لیے اپنی جان کی بازی لگاتی ہے۔“

یہ عالمگیر لڑائیاں جنہوں نے اس صدی میں پوری دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے نظامِ سرمایہ داری کا ضروری حصہ ہیں۔ استعماری ممالک جب ہوا کے رخ کو دیکھ کر یہ محسوس کرتے ہیں کہ اُن کے مال کی نکاسی مشکل ہو گئی ہے تو وہ پھر ایک سوچی سمجھی تجویز کے مطابق اس قسم کی چالیں چلنا شروع کرتے ہیں جس سے جنگ کے خطرات بڑھ جائیں۔ اس وجہ سے اُن کے مال کی طلب کچھ دیر کے لیے بڑھ جاتی ہے اور فیزکس کا وقتی طور پر اُن کے اپنے ملک سے غائب ہو جاتی ہے۔

منڈیوں پر قبضہ صرف قوت کے بل پر ہی نہیں کیا جاتا بلکہ اس کے لیے بعض اوقات ایسے جیسے اور بہانے اختیار کیے جاتے ہیں کہ اُن کے تصور سے بھی شرم محسوس ہوتی ہے۔ ان میں ایک طریقہ مصنوعی ارزانی (Damping) ہے۔ اس میں صرف منڈی پر تسلط قائم کرنے کے لیے وہاں کثیر تعداد میں اشیاء نہایت ہی ارزاں بیچ دی جاتی ہیں۔ اور جب مخالفین اس ارزانی کی تاب نہ لا کر مقابلہ اور مسابقت کو ترک کر دیتے ہیں تو اس کے بعد اشیاء برآمد کرنے والوں کا یہ گروہ نہایت ہی آسانی سے اپنی من مانی کارروائیاں کرتا ہے۔ اس طریقہ سے سب سے زیادہ نقصان جس طبقہ کو پہنچتا ہے وہ مزدور ہے۔

یہی نہیں بلکہ دنیا کے دو متمند طبقے اپنے منافع کو ہر قسم کی دست برد سے بچانے کے لیے اکثر اوقات نہایت ہی ناپاک ذرائع اختیار کرتے ہیں۔ اس کے لیے گندم کی کھڑی فصلیں جلا دی جاتی ہیں تاکہ اناج کی رسد بڑھ کر اُن کے منافع میں کمی نہ کر دے مشہور مصنف جان گنٹھر (John Gunther) انہی اخلاق سوز حرکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

۱۹۱۴ء میں برازیل کے ارباب ثروت کے سامنے یہ مسئلہ درپیش تھا کہ پیدا شدہ

کافی Coffee کو کس طرح کم کیا جائے پیسے انہوں نے اس کو دفن کرنے کا غم کیا۔ مگر اب مصیبت یہ آئی کہ ۱۰ لاکھ بریوں کو دہانے کے لیے بھی کافی رقبہ درکار تھا۔ اس کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ انہیں سمندر میں پھینک دیا جائے مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی۔ کیونکہ اس سے بیشمار مچھلیوں کے تباہ ہونے کا خطرہ تھا۔ بالآخر بہت زیادہ سوچ بچار کے بعد یہ طے ہوا کہ اس کو جلادیا جائے۔ چونکہ اس پودے میں پانی کی کافی مقدار موجود ہوتی ہے اس لیے اس کو جلانا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ آخر کار مٹی کے تیل سے اس کو جلایا گیا۔ اس طرح برازیل کو ہر سال اس زائد پیداوار سے نجات حاصل کرنے کے لیے تقریباً ۲ لاکھ پونڈ کی مالیت کا تیل صرف کرنا پڑا۔

اسی طرح ایک دوسرا مصنف سرمایہ دار طبقہ کی اسی بے حسی کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے :-

۱۹۳۲ء میں لوڈ پول کی بندرگاہ سے دس لاکھ ٹن گندکوں کو سمندر کی موجوں کی نذر کر دیا گیا

”تاکہ رسد بڑھنے نہ پائے اور اس طرح قیمتوں میں کمی واقع نہ ہو۔۔۔ یہی وہ نگہ تھے

جن کے لیے لوڈ پول کے بچے ترستے تھے اور ان کے لیے یہ ایک جنس نایاب تھی“

وہ شخص جس نے موجودہ عہد کی تحریکات کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیا ہے وہ اس حقیقت سے

اچھی طرح واقف ہے کہ اس نظام سرمایہ داری کی اساس الحاد ہے۔ چنانچہ اس نئے ”دین“ کے ساتھ

جو نیا فلسفہ اخلاق دنیا میں مقبول ہوا اس کے لیے اگر کوئی لفظ موزوں ہو سکتا ہے تو وہ صرف ”مقاومتی“

ہے۔ اس کے مطابق ہر وہ طریقہ جائز اور صحیح ہے جس سے کوئی ”دنیاوی فائدہ“ حاصل ہونے کی توقع ہو

اور وہ کام قطعاً ہے جس کے کرنے سے اس میں کمی واقع ہوتی ہو۔ اس لیے اس نظام میں اخلاقی

پیمانے ہر لمحے اور ہر آن ایک ایک فرد کے ساتھ بدستے رہتے ہیں یہی وہ اصل وجہ ہے کہ وہی ٹوٹا

Inside Latin America

Hindranath Mukerjee : An Introduction to Socialism p. 16

حضرات جو وسیع المشرقی اور جمہوریت کے سب سے زیادہ داعی تھے اور جنہوں نے بہت زیادہ جدوجہد کے بعد مالکان زمین کے مقابلہ میں اپنے ووٹ کا حق تسلیم کرایا تھا۔ اس بات کے لیے تیار نہ ہوتے تھے کہ اس ووٹ کا حق وہ ان لاکھوں کروڑوں انسانوں کو بھی دے دیں جن کے رزق پر ان کا قبضہ ہے۔ وہ اپنے لیے تو یہ حق سمجھتے تھے کہ اپنی انجمنیں بنا کر اپنے ہاتھوں کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کریں اور اس طرح اپنے مخالف طبقوں کے مقابلہ میں نہایت ہی قوت کے ساتھ صف آرا ہو سکیں مگر جب یہی حق مزدور طلب کرتے تو ان کی پیشانیوں پر تیور آ جلتے اور ان کے غیظ و غضب کا طوفان کسی طرح ٹھمنے نہ پاتا۔ چنانچہ مزدوروں کو اپنے اتحادیئے (Unions) بنانے کا حق بہت سی کوششوں کے بعد حاصل ہوا۔ جن لوگوں نے مزدوروں کی ان انجمنوں کو کام کرتے دیکھا ہے وہ اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ ان کی راہ میں سرمایہ دار کس طرح رکاوٹیں ڈالتا ہے۔ محنت کش عوام کی مفلسی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر وہ کس طرح انہی کے اپنے طبقہ میں سے بعض ایسے منافق تلاش کر لیتا ہے جو اس کے آلہ کار کی حیثیت سے کام کرتے ہیں اور مزدوروں کی یک جہتی اور اتحاد کو صدمہ پہنچاتے ہیں۔ ملک کا سرمایہ دار روپیہ کی مدد سے غرباء کے ووٹ خرید کر حکومتوں کے ایوانوں تک پہنچاتا ہے اور وہاں رسائی حاصل کر لینے کے بعد وہ حکومت کی مدد سے ان مزدوروں کو ہر قسم کی تحریکات کو قوت سے دبا دیتا ہے یہ پچاسے جب کبھی اپنی مظلومیت کا احساس کرتے ہوئے سر اٹھاتے ہیں تو حکمران طبقہ کی توپوں کے دھانے ان پر کھول دیے جلتے ہیں۔ پروپیگنڈا کی پوری مشینری کو ان کے خلاف حرکت میں لاکر انہیں اس طرح بدنام کر دیا جاتا ہے کہ وہ پھر جیتے جی بولنے کی جرات نہیں کرتے۔

اس جہد میں دولت و سیاست جس طرح ایک دوسرے کے ہم رکاب ہیں اس کا اندازہ پچھلے چند سال کے واقعات سے لگایا جاسکتا ہے۔ جوزف ا۔ لیگٹن (Joseph A. Leighton) نے اپنی کتاب Social Philosophies in Conflict میں اس کی متعدد مثالیں دی ہیں جن میں یہاں چند نقل کی جاتی ہیں۔ ان سے صورت حالات کا ایک سرسری سا اندازہ ہو سکے گا۔

۱۹۳۵ء میں رائے برنیل (Rayburn Bill) پر ملک میں ایک ہنگامہ

بپا ہوا۔ سینٹ کے ممبروں اور پارلیمنٹ کے ارکان کے گھروں میں بے شمار تارین بھیجی گئیں۔ صرف ایک شہر کی تاروں کی تحقیقات کرنے پر معلوم ہوا کہ پندرہ ہزار میں سے صرف تین اشخاص نے پیسے ادا کیے۔ افراد کو اپنے دستخط دینے کے لیے معاوضہ دیا جاتا اور افراد کے نام بڑی بڑی Directory میں سے حاصل کیے جاتے۔ اکتیس ہزار تاروں میں سے جو ۲۵ شہروں سے دی گئیں، ان میں سے ۱۳ افراد وہ تھے جنہوں نے ان کی قیمت خود ادا کی۔ باقی سارے اخراجات گیس اور بجلی کی کمپنی نے برداشت کیے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس بل کو ناکام بنانے کے لیے کمپنی کو آٹھ اور نو لاکھ کے درمیان رقم خرچ کرنا پڑی۔ اس نے بعض اخبارات کو یہ دھمکی دے کر تنقید سے روک دیا کہ اگر وہ اس بل کی حمایت کریں گے تو انہیں شہر ہٹا دینا بند کر دیے جائیں گے۔

آپ خود اندازہ لگائیں کہ کیا ملک کا مزدور اپنی کسی بات کو حکومت سے منوانے کے لیے اس سے نصف رقم بھی صرف کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ امرا حکومت کے سیاہ و سپید کے مالک ہوتے ہیں اور وہ قوانین کو جس طرح چاہتے ہیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتے ہیں۔ فرد در بیچارہ بالکل ان کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔ وہ اپنے اندر اتنی مہبت بھی نہیں رکھتا کہ یہ بھی سکے کہ حضور میرے بیمار پڑنے پر مجھے بھی باتخوہ رخصت دی جائے۔ اور بڑھاپے کی حالت میں جب کہ بندہ نے اپنی طاقت اور جوانی سب کچھ جناب کے قدموں میں قربان کر دیا ہے مجھے اتنا تو دے دیا جائے جس سے زندگی کی ٹٹھاتی کوچھ دیر قائم رہ سکے۔ دنیا کا سرمایہ دار طبقہ جو آزادی کا نعرہ لگاتا ہوا، اور ذاتی مفاو کی برکات کا ذکر کرتا ہوا کبھی نہیں تھکتا جب اس مقام پر آتا ہے کہ یہی حق وہ دوسروں کو بھی دے تو یہاں وہ سب کچھ بھول جاتا ہے۔ اس کی نگاہیں بدل جاتی ہیں۔ اس کے اخلاقی معیار تبدیل ہو جاتے ہیں۔

(سرمایہ داری نظام کے سامنے ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ اپنے آپ کو تجارتی چکر (Trade Cycle)

کے شر سے کس طرح بچائے۔ ۱۹۳۵ء کی سر د بازاری کے بعد اس سوال نے بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ اب دنیا کے سارے ممالک اس مصیبت کا تدارک سوچ رہے ہیں۔ مگر وہ اپنی ساری کوششوں کے باوجود اس کا کوئی خاطر خواہ حل تلاش نہیں کر سکے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی طریقہ کار گر ہو سکتا ہے تو وہ یہی کہ حکومت عدم مداخلت کی پالیسی کو خیر باد کہہ کر ملک کی معاشی تنظیم ایک منصوبہ بندی کے تحت کرے اور اس طرح پیداوار کے سارے ذرائع وہ اپنی تحویل میں لے لے۔

جن لوگوں نے سرمایہ داری نظام کے اس روگ کا ذرا گہری نظر سے تجزیہ کیا ہے وہ اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اس کے اصل اسباب معاشی نہیں بلکہ غیر معاشی ہیں۔ جب ملک کا سرمایہ یہ دیکھتا ہے کہ مزید سرمایہ کاری سے اُس کا منافع بڑھے گا تو وہ پھر اپنے سرمایہ کو بے دریغ مختلف صنعتوں میں لگانا ہے۔ اس سے کام بڑھتا ہے۔ فردوں کو فردوی ملتی ہے اور اس طرح اُن کی قوت خرید بڑھنے سے اُن کی طلب میں کسی قدر اضافہ ہو جاتا ہے۔ ان کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لوگ نئے نئے کام شروع کرتے ہیں۔ وہ بغیر سوچے سمجھے سود پر روپیہ بیتے چلے جاتے ہیں۔ سرمایہ دار کو جب اپنے روپے کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنی شرح بڑھا دیتا ہے۔ جب یہ طبقہ پیدائش میں سے فیادہ حصہ لینے کی کوشش کرتا ہے تو منتظیلین کا نفع کم ہو جاتا ہے۔ دوری طرف گرم بازاری کے اس دور میں فرد کو اگرچہ کام ملتا ہے، اس کی اجرت بڑھتی ہے مگر وہ اس رفتار سے نہیں بڑھتی جس رفتار سے کہ اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ لہذا ان کی قوت خرید گر جاتی ہے۔ اس لیے بعض اشیاء کی طلب قدرتی طور پر گھٹ جاتی ہے۔ مگر اس معاشی تنظیم میں یہ ناممکن ہے کہ سرمایہ دار اپنے سرمایہ کو جلد از جلد دوسری طرف منتقل کر دے۔

علاوہ ازیں جس طرح اہل صنعت کی مانگ میں اضافہ ہونے کا احساس پیدا کرنے کے لیے کچھ عرصہ درکار ہے، اسی طرح مانگ میں کمی واقع ہونے کی صورت میں بھی انہیں کچھ عرصہ کے بعد اس کا احساس ہوتا ہے کہ اب بازار سرد پونے لگا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ادھر تو اس

کی مانگ گنتی چلی جاتی ہے اور ادھر اس کی پیداوار میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے پھر جب کچھ عرصہ کے بعد اہل صنعت بازار کی نبضوں پر ہاتھ رکھ کر یہ محسوس بھی کر لیتے ہیں کہ اب اس کی رفتار بہت سست ہے تب بھی ان کے سامنے یہ مسئلہ درپیش ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں وہ شے مطلوبہ کی جو مقدار تیار کر چکے ہیں اس کی نکاسی کے لیے کیا تدابیر اختیار کریں۔ یہ مصیبت صرف ایک کارخانہ دار پر نازل نہیں ہوتی بلکہ سب پر ٹوٹتی ہے۔ حتیٰ کہ پورے سماج کے لیے یہ امر دشوار بن جاتا ہے کہ اشیائے مطلوبہ کی ایک کثیر اور وافر مقدار کو بازار میں کس طرح فروخت کیا جائے۔ منافع کے امکانات ذرا تاریک ہونے کے ساتھ ہی سرمایہ دار پر ایک جنون کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور وہ اس قسم کی حرکات کرنے لگتا ہے جس سے محسوس ہوتا ہے کہ اُس کے ذہن پر ایک زبردست خوف طاری ہے۔ وہ ایک طرف مال کی پیداوار کم کر دیتا ہے اور دوسری طرف مال کی نکاسی کی فکر کرتا ہے۔ اُس کی ان حرکات سے اشیاء کی قیمتیں گر جاتی ہیں۔ جب یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے تو بڑی تعداد میں کارخانے بند ہونے لگتے ہیں۔ مزدوروں کی ایک بڑی اکثریت بیکار ہو جاتی ہے اور منڈیوں کی گرم بازاری اچانک سرد بازاری میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ آفت جو سرمایہ دار ممالک پر آٹھویں دسویں سال نازل ہوتی ہے اس نظام کی سب سے بڑی کمزوری ہے جسے دور کرنے کا کوئی طریقہ ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔

اگر آپ اس کو ذرا غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ یہ سب کچھ دولت پرستی کا کرشمہ ہے۔ اور اس کی وجہ بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ ذاتی مفاد ہماری زندگی کا رہنما اصول بن گیا ہے۔ اس لیے جب اہل ثروت یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے منافع کم ہو گئے ہیں تو وہ بڑے ہی مضطرب ہو جاتے ہیں اور سرمایہ کاری سے اس طرح ہاتھ کھینچتے ہیں کہ پورے ملک تباہی کی آغوش میں چلا جاتا ہے۔ اگر لوگوں پر رویہ کی محبت غالب نہ ہو تو وہ معاشی تنظیم کرتے وقت یہ سوچ لیں کہ اُن کی کسی پالیسی سے کتنے غریب تباہ ہوں گے۔ مگر سرمایہ دار کے دل میں انسانیت کی محبت سے زیادہ منافع کی محبت ہے اور اسی وجہ سے سوسائٹی بار بار تجارتی چکر کے گرداب میں پھنستی ہے۔

سرمایہ دار نہ نظام کو جو چیز غذا بہم پہنچا رہی ہے وہ سود ہے اس میں افراد کو یہ پورا حق دیا

گیا ہے کہ وہ اپنے گاڑھے پسینے سے کمائی ہوئی دولت کو جمع کریں اور پھر اسے سود پر چلائیں۔ سود ایک قابل نفرت برائی کی حیثیت سے تو پہلے بھی سوسائٹی میں چلا آتا تھا مگر جدید نظام کا کمال یہ ہے کہ اُس نے اس بُرائی کو عین بھلائی میں، اور اس ظلم کو عین خدمت میں تبدیل کر دیا ہے۔ اس وجہ سے اب معاشی نظام اس طرز پر ڈھالا گیا ہے کہ سوسائٹی بجائے پوری انسانیت کی پاسبان اور محافظ بننے کے صرف سود خواروں اور اس کے ساتھیوں کی پشت پناہ بن کر رہ گئی ہے۔ اس وجہ سے سماج میں ایک ایسے طاقتور طبقے نے جنم لیا جو عوام سے ہر طرح کا فائدہ تو اٹھاتا ہے مگر اُن کی مصیبتوں میں کسی طرح بھی شریک نہیں ہوتا۔ اُسے اگر کوئی غرض ہے تو اپنے ”معتین معاوضہ“ سے۔ وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ کاروبار زرتی کر رہا ہے تو پھر بے دریغ ہو کر اپنا دیرپہ لگانا ہے۔ اس طرح سود کی شہرح بڑھتی ہے اور پھر نفع کے امکانات مخدوش ہو جاتے ہیں۔ اُس کی اپنی ہی ”کرم فرمائوں“ سے جب کاروبار سرد پڑنے لگتا ہے تو پھر یہ ظالم بجائے سماج کی امداد کرنے کے ان پر آشوب حالات میں اپنا لگا ہوا سرمایہ واپس لینا شروع کر دیتا ہے۔ سرمایہ کاری میں کمی ہو جانے کی وجہ سے سوسائٹی میں کام کا دائرہ اور بھی سکڑتا ہے یہاں تک کہ ساری دنیا پر سخت کساد بازاری کی آفت آ پڑتی ہے۔ مگر ان حالات میں بھی نقصان، زحمت، خطرے سب دوسروں کے لیے ہیں اور وہ ان آفتوں سے بالکل محفوظ ہوتا ہے۔ مشہور مفکر لارڈ کنیئر Lord Keynes، نظام سرمایہ داری کی بد حالی کا ذکر کرتے ہوئے سود کو اس کا سب سے بڑا ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔ اُس کا تجزیہ یہ ہے کہ سود کے بڑھنے سے منافع کے امکانات گھٹ جاتے ہیں اور جب سوسائٹی پر یہ کیفیت طاری ہو جائے تو کاروبار سرد ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

”یہ بھران اس وجہ سے پیدا ہوتا ہے کہ شرح سود معاشی مشین کے پتھوں کو بریک

لگا دیتی ہے“

سرمایہ دار طبقہ کا یہ سنگدلانہ اور ظالمانہ رویہ صرف افراد ہی سے نہیں ہوتا بلکہ قوم و ملت کے ساتھ بھی وہی سلوک روا رکھتا ہے۔ وہ اگر قوم اور ملک کو بھی اپنا دیرپہ مستعار دیتا ہے تو اس

شرط پر کہ اسے بہر حال اپنا منافع ملنا چاہیے۔ حد یہ ہے کہ اگر ان پر کوئی آفت بھی آئے اور افراد کو اپنی جانوں تک کی قربانی دینی پڑے تو ان حالات میں بھی اس ذلیل طبقے کا مطالبہ بہر حال اپنی جگہ اٹل رہتا ہے کہ ان کے سرمائے پر اتنے فی صدی سود سا ہر سال تک ضرور ادا ہوتے رہنا چاہیے۔ سود کے اصول پر منافع کے ایک طرفہ بہاؤ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ پوری دنیا کا معاشی توازن ہی بگڑ گیا ہے۔ یہ ہیں وہ مفاسد جو اس نظام کے تن بدن سے پیپ بن کر نکل رہے ہیں۔ ان مفاسد کو خود سرمایہ دارانہ نظام معیشت کے کارپرداز محسوس بھی کرتے ہیں، اور اصلاح حال کی تدابیر بھی سوچتے ہیں۔ کہیں مزدوروں کی اجرتوں میں اضافہ کیا جاتا ہے، کہیں انہیں منافع میں شریک کرنے کی فکر کی جاتی ہے۔ کہیں انہیں علاج کی سہولتیں دی جاتی ہیں۔ مگر جو کچھ ہو رہا ہے وہ بالکل ناکافی ہے۔ کارل (Carlyle) نے جو بات کئی سال پیشتر کہی تھی وہ آج بھی اسی طرح سچ ہے۔ ترقی کے اس زمانہ میں بھی اگر ایک طبقہ اس وجہ سے چیخ رہا ہے کہ اس کی ۲۰ لاکھ فیصیں بیکار پڑی ہیں اور اُن کا کوئی گاہک نہیں ملتا تو دوسری طرف بیس لاکھ انسان اس لیے چلا رہے ہیں کہ اُن کے پاس تن ڈھانکنے کے لیے کپڑا نہیں۔ ان ساری تدابیر میں سے کوئی بھی کارگر ثابت نہیں ہوتی۔ اگر آپ پچھلے پچاس سال کے حالات کا ایک سرسری سا جائزہ بھی لیں تو معلوم ہو گا کہ معاشی ارتقاء کے لیے جس دستِ غیب (Invisible hand) کا سہارا لیا گیا تھا وہ بالکل فضول ثابت ہو چکا ہے۔ سرمایہ داری کے اندھے متقدمین جو چاہیں کہتے رہیں مگر یہ حقیقت اپنی جگہ مستحکم ہے کہ یہ نظام انسانیت کی فلاح کے نقطہ نظر سے سخت ناکام رہا ہے۔ اس میں سے جو مفاسد ابھر کر سامنے آئے ہیں اُن کی روک تھام کی ساری کوششیں بالکل عبث اور بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔ اور اُن کا حاصل صرف یہی ہے۔ ع

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی!

جو اصحاب سرمایہ دارانہ نظام کے جمہوری پہلو پر مزید طالعہ فرمانا چاہیں وہ مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔
(بقیہ پر صفحہ ۱۲۴)